بنیاد جلد ۶، ۲۰۱۵ء

وحید الظفر خاں *

اقبال کا تصورِ تنہائی: نظم "تنہائی" کے پس منظر میں

تنہائی فارسی زبان میں لکھی گئی اقبال کی انتہائی بصیرت افروز نظم ہے۔ جس میں تخیل کی روانی پوری توانائی کے ساتھ مفہوم کو منکشف کرنے میں وجدانی تسلسل کی تخلیق کرتی ہے۔ ازابتدا تا انتہا اسرار خودی کا اثبات اور فلسفہ وحدت الوجود کی نفی کے ساتھ ساتھ کائنات، خدا اور انسان کے باہمی تعلق کی رمزیت اور شاعرانہ فنکاری کا ایک غیر معمولی شاہ کار نظر آتی ہے۔ جب آپ اقبال کے تصورِ تنہائی سے متعارف ہوتے ہیں تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ شعری روایت کا تصورِ تنہائی دھیرے دھیرے کہیں تحلیل ہو رہا ہے اور ایک ایسا تصور ابھر رہا ہے جو آپ کو کائنات کی عظیم الشان وسعتوں سے ہم آمیز کرتے ہوئے آپ کے وجود کو ایک خاص انداز میں منفرد اور ممیز کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ تصورِ تنہائی کسی محبوب سے بچھڑنے یا روایتی ہجر و فراق کے تجربے سے کوئی ربط نہیں رکھتا اور نہ ہی دنیا کی شورشوں سے اکتا کر فطرت کی آغوش میں پناہ لینے کی آرزو کا اظہار ہے۔ یہ ایک روح کا سفر ہے جو روح کے اندرون میں طے ہوتا ہے۔ اس نظم میں جن موجوداتِ ارضی و سماوی کو مکالمے کے لیے منتخب کیا گیا ہے وہ بالترتیب قرآن کی سورۃ الانبیاء کی ۳۰، ۳۱ اور ۳۲ آیات میں موجود ہیں جہاں پہلے سمندر پھر پہاڑ اور آخر میں چاند کا تذکرہ صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔[1] (کیا یہ محض اتفاق ہے یا شاعر نے دانستہ طور پر ان آیاتِ قرآنی کی ترتیب و تسلسل کو شاعرانہ نغمگی کے ساتھ انتہائی فنکارانہ فطانت سے آراستہ کیا ہے؟)

سمندر کی گہرائیوں سے آفاق کی بے کراں بلندیوں تک تمام مظاہر موجودات خالق کی خلاقی کا لاثانی نمونہ ہیں ۔ ہر تخلیق اس کی صناعی کی عظمت کی بزبان خود شاہد ہے جو باہمی ربط و اتصال سے ایک منضبط وحدت میں مصروف کار ہیں ۔ سوائے انسان کے جو براہ راست ذات خداوندی سے ربط و اتصال کا داعی ہے ۔ انسان کے سوز دروں سے یہ عظیم کائنات پوری طرح محروم ہے ۔ انسان اس کائنات کا ایک نا قابل تقسیم حصہ ہوتے ہوئے بھی کائنات سے ماورا ہے ۔ اپنی ذات کے عرفان کے تجسس و تلاش سے عرفان خدا کا حصول ایک ایسا مقصد ہے جو کائنات کے اس بوقلموں موجودات سے انسان کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرتا ہے اور یہی وہ تصور تنہائی ہے جو اقبال کے وجدانی تجربے کا ماحصل ہے ۔ جو عظمت آدم کا نقیب ہے ۔ اس کائنات کی وسیع و عریض پنہائیوں میں انسانی مقام علویت کا نمائندہ ہے ۔ کیونکہ اس جیسا کوئی دوسرا وجود پیدا ہی نہیں کیا گیا ۔ تمام مظاہر کائنات آدم کی وحدت اور اس کے وجود کی اکائی کے گواہ بن کر اس صداقت کی توثیق کرتے ہیں ۔

مزید وضاحت کے لیے نظم سے براہ راست استفادہ ضروری ہے جو صرف چار بندوں پر مشتمل ہے ۔ جس میں ہر بند اپنی انفرادیت کا حامل ہوتے ہوئے بھی ایک غیر مرئی داخلی رشتے سے باہم دگر پیوست ہے ۔

به بحر رفتم و گفتم به موج بیتابی
همیشه در طلب استی چه مشکلی داری؟
هزار لولوی لالاست در گریبانت
درون سینه چو من گوهر دلی داری
تپید و از لب ساحل رمید و هیچ نگفت[۲]

تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے موج کے اضطراب و بیتابی سے استفسار کیا گیا ہے کہ کیا وہ بھی انسانی دل کی طرح طلب و جستجو کی مسلسل تڑپ اور بے چینی سے مملو ہے ۔ جس کا جواب مکمل خاموشی کی صورت میں دیا گیا ہے لیکن یہ سکوت بے حد معنی خیز ہے ۔ ''سکوت لالۂ و گل سے کلام پیدا کر''[۳] Silence is the language of poetry کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جواب کے لیے زبانی گفتگو ضروری نہیں ۔ سمندر کی موج کے ردعمل ''تپید و رمید'' میں سوال کا واضح جواب موجود ہے، جس سے ایک احساس محرومی اور پچھتاوا ابھرتا ہے ۔ کیونکہ بار امانت کو اٹھانے میں زمین و آسمان قاصر رہے صرف انسان نے اس بار امانت کو

اٹھانے میں پیش قدمی کی یہی وجہ ہے کہ اس سوال کا سامنا نا قابلِ برداشت ہے۔سوزِ دروں متاعِ بے بہا ہے جس کی محرومی کا احساس فرار کی طرف مائل کرتا ہے جو لفظ ''رمید'' سے ظاہر ہے۔اس نا قابلِ تلافی نقصان سے جو کرب و اضطراب ابھرتا ہے اس کیفیت کی وضاحت ''تپید'' سے ہوتی ہے۔

قرآنی وضاحت جس کی توثیق موجودہ سائنسی نظریات سے بھی ہو چکی ہے کہ ہر شے کی تخلیق کا محرک پانی ہے۔اس روئے زمین پر انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ جو بھی موجوداتِ زندگی کے ارتعاش سے لبریز ہیں ان کے ابتدائے آفرینش میں پانی کے عنصر کی بنیادی کارکردگی ہے یہاں تک کہ جیسا قرآن کہتا ہے کہ وکان عرشہ علی الماء [۴] (اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا)۔غالباً یہی وجہ کہ اقبال نے اس نظم کی ابتدا اصولِ حیات (Principle of Life) کے بنیادی عنصر سے ہی کی ہے۔یعنی سمندر جو مصدرِ حیات بھی ہے اور محرکِ حیات بھی اور جہاں یقینی طور پر تخلیق کے بنیادی رموز موجود ہیں جس کی تصدیق قرآنی آیات میں خاص طور پر سورۃ الانبیاء کی یہ آیت وجعلنا من الماء کل شیٔ حی [۵] (ہم نے پانی سے ہر شے کی تخلیق کی اور زندگی پیدا کی)۔اقبال کے بقول سمندر محرکِ حیات ہونے کے باوجود بھی جذب و شوق اور سوزِ آرزو سے محروم ہے حالانکہ اس کا کشکول آبدار موتیوں کے خزانے سے معمور ہے مگر گوہرِ دل سے خالی ہے۔کسی چیز کی برتری یا کمتری کی اہمیت واضح کرنے کے لیے تقابل ضروری ہوتا ہے جو منطقی فیصلے پر مبنی ہوتا ہے۔اس نظم میں اقبال نے اسی تکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے محض وجدانی تصور پر ہی انحصار نہیں کیا ہے۔عقلی پہلو کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔

دوسرا بند ملاحظہ کریں:

بہ کوہ رفتم و پرسیدم این چہ بیدردیست
رسد بگوش تو آہ و فغانِ غم زدہ ای
اگر بہ سنگ تو لعلی ز قطرۂ خونست
یکی در آ بہ سخن با منِ ستم زدہ ای
بخود خزید و نفس در کشید و ہیچ نگفت [۶]

یہاں تخاطب براہِ راست پہاڑ سے ہے اس بنیاد پر کہ شاید یہ صاحبِ دل ہو اور میرا ہم نشین بن سکے میری آہ و فغاں سے اس سنگ زار میں کوئی ہل چل ہو اور میرا غم بانٹ سکے تا کہ تنہائی کے اضطراب کو سکون میسر ہو۔شاید اس عظیم جسم میں کوئی ایسا لعل موجود ہو جس کی قطرۂ خوں سے نمو ہوئی ہو جو سوزِ دروں کی تپش کا

اندمال کرسکے جواس کرب تنہائی میں غم گسار بن کر شریکِ فغاں ہو سکے۔لیکن یہاں بھی دستک رائیگاں گئی۔آہ بےاثر ہوئی پہاڑنے کوئی التفات نہ کیااور بےنیازی سےاپنی ذات میں سمٹ کردم سادھ لیااورمہرِسکوت ثبت کرلی۔سطحِ زمین پر بلند ترین وجود پہاڑ ہےاس کے بعد خلاے بسیط کا فلک سے اتصال ہے۔روایتی شاعری کے پیشِ نظرآہ وفغاں کا سفرعمودی ہے جوآسمان کی طرف مائل پرواز ہے۔زمین سے آسمانوں تک جانے والی آہ و فغاں یقیناً پہاڑ کی چوٹیوں سے گذرتی ہے۔اس امکان کومدنظر رکھتے ہوئے شاعر کااستفسار کہ پہاڑنے اس کی آہ و فغاں کوضرور سنا ہو گا ایک شاعرانہ منطق رکھتا ہےلیکن یہاں ایک مزید اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ قرآن کی سورۃ الانبیاء میں بھی پانی کےفوراًبعد پہاڑ کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو پہاڑ کے انتخاب کوایک نئی جہت عطا کرتا ہے وجعلنا فی الارض رواسی ان تمید بھم [۷] (ہم نے پہاڑوں کوزمین میں میخوں کی طرح پیوست کیا)۔ گویایہ بھی شاعر کےارادی شعری منصوبےکاایک ضروری حصہ ہو،وگرنہ اس روئے زمین پر بےشمار مظاہرِفطرت پھیلے ہوئے ہیں اس لیے یہ انتخاب ایک سوچےسمجھے منصوبےکا اشاریہ بھی ہوسکتا ہےاور تنہائی کے احساس کو شہادت کےذریعےتقویت فراہم کرتا ہے۔

ره دراز بریدم ز ماه پرسیدم
سفر نصیب، نصیب تو منزلی است کہ نیست
جہان ز پرتو سیمای تو سمن زاری
فروغ داغ تو از جلوه ولی است کہ نیست
سوی ستاره رقیبانہ دید و ہیچ نگفت [۸]

اقبال کی شعری کائنات میں چاند کا کردار پیغام رساں کا بھی ہے”کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی/فلک پہ عام ہوئی،اخترِ سحر نے سنی“ [۹] بانگِ درا کی نظم ”چاند“ میں اقبال چاند کے کردار سےاپنی کیفیت کاموازنہ اسی طرح کرتے ہیں۔

آہ میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے
تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے
پھر بھی اے ماہِ مبیں! مَیں اور ہوں تُو اور ہے

درد جس پہلو میں اٹھتا ہو، وہ پہلو اور ہے
گرچہ مَیں ظلمت سراپا ہوں،سراپا نور تُو
سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دُور تُو[۱۰]

اسی مفہوم کی دوسری نظم ''جگنو'' میں اس طرح دوہراتے ہیں:

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے[۱۱]

یہاں درد کی کسک، ذوق آگہی، عشق کا نور، سوز اشتیاق دید، ایسے انسانی تجرباتی کیفیات ہیں جن سے چاند محروم ہے۔اور یہی وہ امتیازی تقابل ہے جو شاعر کے مافیہ کی ترسیل میں catalyst کا کام کرتا ہے اس بند میں اسی تقابلی کیفیت کے اظہار کے لیے استفسارانہ تکنیک کو بروئے کار لایا گیا ہے، جس کا ایک اعتراقی پہلو اس شعر سے نمایاں ہے:

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تُو، تنہا ہوں میں[۱۲]

اقبال نے بحر، کوہ اور قمر کو اس نظم میں بحیثیت شاہد پیش کیا ہے جو بیک وقت کائنات کا سمبل بھی ہیں اور انفرادی کردار کے روپ میں بھی جلوہ گر ہیں۔اس بند میں چاند کا ستاروں کی طرف رقیبانہ انداز سے دیکھنا دو سطحوں پر جانچا جا سکتا ہے۔پہلا یہ کہ ستاروں کے پاس وہ داغ ہی نہیں ہے جو سائل کوان کی طرف ملتفت کرے اور وہ سوز و آرزو کی بابت سوال کرے۔اور دوسرا سبب یہ کہ چاند کی روشنی مستعار ہے اور ستارے اپنی ذاتی ضو سے مستنیر ہیں۔اس لیے بھی رقابت کا عنصر فطری ہے۔

جس طرح بحر کی موج نے ردِ عمل سے اپنے جواب کو واضح کیا ہے اسی طرح کوہ اور قمر کے ردِ عمل سے جواب حاصل کیا گیا ہے۔یہ شعری طریقہ فنی ندرت کا ایک اعلیٰ نمونہ کہا جا سکتا ہے جہاں body language کو جواب کی ترسیل کا ذریعہ بنایا گیا ہے اور ''پیچ نگفت'' میں پوری گفتگو کو سمیٹ لیا گیا ہے۔پیرایہ بدل کر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے مظاہر فطرت کو اپنی فنکارانہ جودت سے تشخص تو بخشا ہے لیکن نطق سے محروم رکھا ہے۔کیونکہ حقیقتاً بھی موجودات سماوی و ارضی جسم تو رکھتے ہیں لیکن قوتِ گویائی سے یکسر عاری ہیں چنانچہ نطق کا کام اشاراتی زبان سے لیا ہے۔جسمانی حرکات و اشارات سے حاصل شدہ جواب کہیں زیادہ واضح اور مؤثر

ہے مزید خوبی یہ بھی ہے کہ ہر کردار کی شخصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے ردعمل کا تعین کیا گیا ہے یعنی اس کی فطری حرکات وسکنات کے عین مطابق ہی اس کے جواب کی وضاحت کی گئی ہے جیسے موج کے لیے "سپید ورمید" پہاڑ کے لیے "بخود خزید و نفس در کشید" اور چاند کے لیے "رقیبانہ دید" کا استعمال کیا گیا ہے جو کسی بھی اعتبار سے ناموزوں یا غیر متعلق نظر نہیں آتا بلکہ درحقیقت اس سے موزوں ترین عمل یا ردعمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جسے ہم فنکار کی ژرف نگاہی اور باریک بینی کا اعلیٰ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

اس ضمن میں یہاں ایک سوال یہ ابھرتا ہے کہ بحر، کوہ اور قمر جیسے کرداروں کو ہی کیوں منتخب کیا گیا۔ کیا اس انتخاب کے منطقی مضمرات بھی ہیں؟ کسی شعری حکمت کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے یا سرسری طور پر جو ذہن میں ابھرا شعری پیکر بنا دیا گیا۔ اس انتخاب کا منطقی راز ایک حیرت انگیز مسرت سے شرابور کر دیتا ہے۔ اقبال جیسے عظیم شاعر کے یہاں سرسری طور پر بے مقصد کسی لفظ کا استعمال نہیں پایا جاتا۔ لیکن مقصد تک رسائی کے لیے گہری نظر اور فکری تعمق کی شرط لازمی ہے۔

سمندر کی عمیق گہرائیوں سے فرازِ کوہ تک مظاہر موجودات کے تین منطقے سامنے آتے ہیں۔ آبی منطقہ، ارضی منطقہ اور فضائی منطقہ۔ لیکن ان تین منطقوں سے کائنات کی تکمیل نہیں ہوتی جس سے یہ کہنے کا استحقاق حاصل نہیں ہوتا کہ "در جہان تو یک ذرہ آشنائم نیست" اس جہان کی تکمیل کے لیے کرۂ آسمانی کی شمولیت ضروری ہے چنانچہ کرۂ آسمانی کی نمائندگی کے لیے چاند ستاروں کے ذریعے اس مرحلے کو پورا کیا گیا ہے۔ اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ نظم کے تین بندوں میں کس سلیقے کے ساتھ پوری کائنات کی تشکیل کی گئی ہے، جو جذب دروں اور قلبی اضطراب کے ارتعاش سے نابلد ہے۔ ساتھ ساتھ سورۃ الانبیاء کی آیت کے ترتیب و تسلسل کا بھی واضح حوالہ موجود ہے: وھو الذی خلق الیل والنھار والشمس والقمر کل فی فلك یسبحون [۱۳]
(اس نے شب و روز اور چاند سورج کی تخلیق کی جو آسمان میں اپنے اپنے دائروں میں سرگرم سفر ہیں)۔

قرآن بھی پانی، پہاڑ اور اجرام فلکی کی شمولیت سے کائنات کی تکمیل کا اعلان کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً اقبال نے اس نظم کے تار و پود سورۃ الانبیاء کی مسلسل آیات سے بُنے ہیں جو سمندر کی گہرائیوں سے بتدریج اور بمراحل مائل بہ ارتقا ہیں، جس کا دوسرا پڑاؤ پہاڑ اور تیسرا ٹھہراؤ آسمانی چاند اور آخری منزل بارگاہ ایزدی ہے۔

ہر بند میں آخری مصرعے سے پہلے دل کے وجود کے بارے میں استفسار ہے۔ ''دل'' جو اقبال کی شاعری کا مرکزی موتیف ہے جس کے اطراف میں ساری کائنات کا مدوجزر ہنگامہ خیز ہے۔ 'دل' جو بار امانت کا حامل ہے۔ دل جو عرفان کی منزلوں میں وصل وفراق کا نمائندہ ہے۔ دل جو عشق کا خزینہ، محبت کا مدینہ اور سوز و آرزو کا سفینہ ہے۔ اسی تسلسل میں یہ بند دیکھیے:

شدم بحضرت یزدان گذشتم از مہ و مہر
کہ در جہان تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہان تہی ز دل و مشت خاک من ہمہ دل
چمن خوش است، ولی درخور نوایم نیست
تبسمی بلب او رسید و ہیچ نگفت[۱۴]

نظم کا آخری بند جس کو حاصل کلام کہا جا سکتا ہے اپنی معنویت اور بلاغت ترسیل کے اعتبار سے انتہائی وقیع نظر آتا ہے یہاں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا منطقی جواز موجود ہے۔ کائنات کی تخلیق آدم کے لیے کی گئی ہے۔ اور آدم کو صرف خدا کے لیے پیدا کیا گیا ہے جو اس کو شرف نیابت سے سرفراز کرتا ہے۔ آدم کا اس کائنات سے کوئی براہ راست تعلق اور کوئی رشتہ نہیں ہے اسی لیے مظاہر کائنات میں اپنا ہم نفس تلاش کرنے کا اظہار ایک ironical statement سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ 'نفخت فیہ من روحی'' صرف انسان اور خالق کا درمیانی رابطہ ہے۔ روز ازل میں اس کا میثاق بھی لیا جا چکا ہے جہاں تمام ارواح نے بیک زبان اعتراف کیا کہ ''ہاں تو ہمارا رب ہے'' اور اسی لیے بار امانت کو بخوشی اٹھا لیا۔ جس کی سعادت سے زمین و آسمان محروم رہے۔ ان حوالہ جات کے پس منظر میں مظاہر کائنات میں غم گساری تلاش کرنا معصومانہ اور طفلانہ طریق کار کے سوا کیا ہے۔ اور ایسے سوال کا جواب ایک مشفقانہ تبسم کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ جیسے کوئی دانش مند کسی بچے کے نادان سوال پر مسکرا کر خاموشی اختیار کر لے۔ شاعر کا مقصد صرف اتنا ہے کہ انسان علائق دنیاوی سے ابھر کر صرف جلوہ گہ ذات میں اپنا ہم سخن تلاش کرتا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں[۱۵]

فرش سے عرش کا عمودی روحانی سفر مختلف درجات کو طے کرتے ہوئے خالق حقیقی سے ہم کلام ہونے

کا شرف حاصل کرتا ہے۔ یہ تجربہ بالکل اس طرح کا ایک رویا (epiphany) ہے جس کے بارے میں خسرو کا کہنا ہے کہ:

خدا خود میر مجلس بود اندر لا مکاں خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

یہ عشق کی ایک جست کا عملی نمونہ ہے کہ کس طرح زمین و آسمان کی پنہائیاں سمٹ جاتی ہیں اور سالک کامرانی سے سرخ رو ہو جاتا ہے۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں[۱۶]

جاوید نامہ کے مندرجہ ذیل اشعار نظم کے بطونی مفہوم اور تہہ نشین اضطراب کا آئینہ دار ہیں:

گفت رومی "ذرۂ گردوں نورد
در دل او یک جہان سوز و درد
چشم جز بر خویشتن کشادہ ای
دل بہ کس نا دادہ ای، آزادہ ای
تند سیر اندر فراخاے وجود
من ز شوخی گویم او را زندہ رود"[۱۷]

اپنے فراخیٔ وجود میں تند سیر ہونے کا محرک وہ دل ہی ہے جو ایک جہان سوز و درد ہے۔ جس کا اظہار "جہان تہی ز دل و مشت خاک من ہمہ دل" میں وضاحت سے موجود ہے۔ "تپیدی بلب او رسید و ہیچ نگفت" دراصل اسے ایک mystic اور mysterious تجربہ کہا جا سکتا ہے۔ اس شعری تجربے میں عام انسانی ذہن کو شامل کرنے اور عبد و معبود کے رشتے کی معرفت اور قربت کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ ایسے انسلاکات سامنے لائے جائیں جن کے ذریعے ترسیل میں سہولت پیدا ہو سکے۔ قرآن میں بھی اسی طریقہ کار کا اظہار موجود ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ کے چہرے کو اس کی ذات سے منسوب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام[۱۸] (اور تیرے رب کا چہرہ جلال و عظمت والا ہمیشہ رہے گا)۔ ابن عربی نے اس صوفیانہ تجربے کو اس طرح بیان کیا ہے:

> In the beatific vision God manifests Himself to the elect in general epiphany which assumes various forms corresponding to the mental conception of God formed by the faithful on earth. The vision impregnates the elect with Divine Light.[۱۹]
>
> (اللہ تعالیٰ اپنے منتخب بندوں کو اپنے دیدار سے مشرف کرتا ہے جو مختلف اشکال میں بندے کے ذہنی ادراک و تصور کی استعداد کے مطابق اس پر ایک رویا کے ذریعے منکشف ہوتے ہیں۔)

اقبال کی شعری کائنات؛ انسان، خدا اور کائنات کے باہمی تعلق کے مضمرات سے مملو ہے۔ یہاں انسانی وجود کی معنویت اس کے مقصدِ تخلیق سے مربوط ہے۔ جس کی صراحت قرآن میں بکھری ہوئی ہے۔ اقبال کی شعری تفہیم کے تناظر میں قرآن کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی وجدانی فکر کی جڑیں عموماً قرآن اور حدیث میں پیوست نظر آتی ہیں جب آپ اقبال کے علمی مآخذ کے پس منظر میں اس نظم کے تصورِ تنہائی کی تہہ نشین معنویت کی تلاش کریں گے تو آپ کو مختلف ابعاد نظر آئیں گے۔

اس تصورِ تنہائی میں ایک احساسِ برتری کی رو چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ انسان جیسے جیسے بلند مراتب حاصل کرتا جاتا ہے تنہا سے تنہا تر ہوتا جاتا ہے۔ خدا بلندتر عظیم تر ہے اسی لیے تنہا تر ہے۔ اس کی وحدانیت ہی اس کی تنہائی ہے۔ احدیت، انفرادیت یا اکیلا ہونا ہی عدیم المثال ہوتا ہے۔ اسی نوع کی تنہائی بھی منفرد ہوتی ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کے علائق سے بلند تر مقام پر پہنچنا تنہائی ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ بھی ہے جس میں کرب و سکون بیک وقت موجود ہے۔ کرب بچھڑنے کا اور سکون تنہا ہونے کا۔ کرب و سکون کا یہ امتزاج ایک ایسی تحریک پیدا کرتا ہے جس سے آرزو کا نمو ہوتا رہتا ہے۔ ''قلندر جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا'' یہ احساس قلندری تنہائی ہے۔ یہ تنہائی کا دوسرا نام قلندری بھی رکھا جا سکتا ہے۔ جس کو اقبال ''لذتِ تنہائی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ساری تگ و دو آرزو کی تحریک سے جنم لے کر ذات الوجود کو پستی سے بلندی کی طرف مہمیز کرتی ہے اور جوں جوں بلندی کے مقامات آتے جاتے ہیں تنہائی منزہ ہوتی جاتی ہے اور پھر ذات کا آئینہ خود ہی حیرت فروش بن جاتا ہے۔ اور سالک لذتِ یکتائی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔

زمینی سطح پر تنہائی انسان کا ایک ایسا حسی تجربہ ہے جو زمان و مکان کی قیود میں محصور نہیں کیا جا سکتا انسانی نفسیات کی آفرینش میں ہم نشینی کے اہتزاز کے ساتھ ساتھ تنہائی کے کرب کا بھی آمیزہ موجود ہے۔ وصل و فصل کا یہ ڈراما انسانی ذہن کے اسٹیج پر ہمیشہ سے کھیلا جاتا رہا ہے۔ فنکاروں نے اپنی فنی ندرت کے التزام کے ساتھ تنہائی کے تجربے کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ ایک ایسا آفاقی منظرنامہ ہے جو صدیوں کی وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ انسانی تاریخ کے وسیع کینوس پر تنہائی کی بے شمار داستانیں درج ہیں جہاں خارجی اور داخلی سطح پر وقت اور مقام سے آزاد تنہائی کا تجربہ موجود ہے۔

اقبال کی پوری نظم ایک ironical statement نظر آتی ہے۔ سطحی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنی تنہائی سے بے زار ہے اور کسی ہم نفس کا متلاشی ہے لیکن اگر بنظرِ غائر اس کی رمزیت کو تلاش کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ تصورِ تنہائی کو glorify کیا گیا ہے تا کہ انسانی وجود کو علائق دنیاوی سے منزہ کرتے ہوئے اس کے مقصدِ تخلیق کو نمایاں کیا جا سکے۔ یہ ہی وہ تنہائی ہے جو مطلوب و مقصودِ مومن ہے اور اس کو تمام کائنات سے افضل و برتر بناتی ہے۔

تنہائی کا دوسرا پہلو اپنی خودی (real self) کی تلاش بھی ہو سکتی ہے جس کو اقبال نے روایتی شاعری سے اٹھا کر گہری معنویت کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ نظم میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ محض التباسِ نظر ہے جس کے مغز اور معنویت کا انکشاف بصیرت کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسے ہی انسان کو اپنی ذات کی شناخت کا عرفان ہوتا جاتا ہے اس میں تنہائی کا احساس بیدار ہوتا جاتا ہے اور وہ اپنی اصل کی طرف لوٹنا چاہتا ہے جہاں سے وہ بنیادی طور پر تعلق رکھتا ہے۔ کل شیٔ یرجع الی اصلہ (ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) کے بمصداق انسان بھی اسی جگہ کا آرزومند رہتا ہے جہاں سے وہ آیا ہے۔ اس لیے مظاہرِ فطرت انسان کی تڑپ، اضطراب اور بے چینی میں اس کے مونس و ہمدرد نہیں بن سکتے۔ کیونکہ وہ اس وجدانی تجربے سے نا آشنا ہیں۔

ہم اس کیفیت کو کائناتی تنہائی بھی کہہ سکتے ہیں۔ انسان کسی بھی نئی جگہ پر تنہائی کے احساس سے فطری طور پر دوچار ہوتا ہے۔ اجنبیت کے احساس کا دوسرا نام تنہائی ہے، کائنات اجنبی ہے "یہ گنبدِ مینائی یہ عالمِ تنہائی" یہاں عالم ذومعنی ہے۔ ایک عالم کا مفہوم کائنات ہے اور دوسرا عالم انسانی کیفیت کو اجاگر کرتا ہے یعنی کائنات اور انسان دونوں اپنی اپنی جگہ پر تنہا ہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ اس تنہائی کا

شعور صرف انسان کو ہی بخشا گیا ہے وہی محسوس کرسکتا ہے کہ وہ اصلاً اس کائنات سے تعلق نہیں رکھتا اس کا تعلق کسی اور مقام سے ہے جس کی طلب وجستجو میں وہ مضطرب ہے۔

مغربی شاعر فطرت ورڈزورتھ کی شعری کائنات میں مظاہر فطرت غم گسار، چارہ ساز، رہنما، وغیرہ کا رول ادا کرتے ہیں ۔ اقبال کے یہاں یہ مظاہر فطرت انسان کے لیے بیگانۂ محض ہیں ۔ورڈزورتھ کا رویہ غم دنیا سے فرار حاصل کرنا اور مظاہر فطرت کی آغوش میں پناہ تلاش کرنا ہے ۔اقبال کا رویہ کہیں ارفع ہے اس کے لیے موجودات فطرت تنہائی کا سدباب نہیں ہیں یا اس کے روحانی کرب واضطراب کا مداوا نہیں ہیں ۔ اقبال کا وژن انسان کو مظاہر فطرت سے بالاتر لے جاتا ہے ۔اس کے لیے مظاہر فطرت اپنے اپنے وجود میں محدود اور انسان کے مقام اعلیٰ سے کم تر اور ناواقف ۔اسی لیے اقبال کے تصور تنہائی کا spectrum کہیں زیادہ وسیع ہو جاتا ہے ۔W. B. Yeats کی شاعری میں بھی ورڈزورتھ کی طرح مظاہر فطرت انسان کی سکون افزائی اور قلبی فرحت وانبساط کا سبب ہیں ۔کولرج ،شیلی ،کیٹس بھی دنیا کی آشفتہ سامانی سے گھبرا کر اپنی تصورات کی دنیا میں فرار حاصل کرتے ہیں ۔مقصد ! تنہائی کی برکتوں سے مستفید ہونا اور گردش روزگار سے نجات حاصل کرنا ہے ۔ مغربی شعرا کے یہاں عزلت گزینی باعث رحمت ہے جو فوری طور پر غم دوراں سے نجات بخشتی ہے ۔لیکن اقبال کے لیے اس کائنات کی اجنبیت اس کے احساس تنہائی کو مزید گہرا بناتی ہے یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اقبال کے تصور تنہائی کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے ۔

اگر اس وسیع سے وسیع تر تناظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ تصور تنہائی انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی ۔ کیونکہ پوری انسانیت بحیثیت ایک کل کے ایک اکائی بن جاتی ہے اور پھر اپنے محیط کے دائرے سے باہر نکل کر قرنوں اور صدیوں پر پھیل جاتی ہے ۔زمان ومکان کے قیود وحدود کو توڑتی ہوئی اولاد آدم کے تسلسل سے آدم تک پہنچتی ہے ۔وہ آدم جو تمام انسانیت کا مبداء ہے ۔اور تنہائی کے کرب کا ابتدائی آشنا جس کے بارے میں قرآن کا واضح اعلان موجود ہے ۔الذی خلقکم من نفس واحدة [۲۰] (وہ جس نے تمھیں ایک نفس سے پیدا کیا) ۔اور یہی وہ نفس واحد ہے جو آج بھی کرب تنہائی سے فغاں بہ لب ہے ۔اجمالاً اس نظم کے بارے میں Plotinus کا قول بھی معتبر نظر آتا ہے:

The flight of the alone to the alone

(تنہائی کی پرواز تنہائی کی جانب)

یہ ایک انتہائی مربوط و منضبط اور محاکاتی نظم ہے۔ اس کی pictorial imagery کی ہر image تنہائی کے تصور کو مزید گہرائی عطا کرتی ہے۔ یہاں تخیل کی رفعت، احساس کی شدت اور الفاظ کی جودت مل کر ایک اکائی کی تخلیق کرتے ہیں جس کو امیاتی کل بھی کہا جاسکتا ہے۔ images کی تجسیم کاری کے ذریعے مکالے کا کام لیا گیا ہے جو کسی حد تک dramatic monologue کی تکنیک سے مماثل ہے۔ اور نظم کو ایک ڈرامائی pattern عطا کرتا ہے۔ نظم کا ہر بند ایک موسیقی آہنگ سے شرابور نظر آتا ہے۔ ہر لفظ ایک ایسے آہنگ میں ڈوبا ہوا ہے جیسے لفظ نہ ہو بلکہ کسی نغمے کا سُر ہو جو کسی روحانی مضراب سے ایک دلکش symphony میں ڈھل گیا ہو۔

اس نظم میں کردار حقیقی (realistic) نہیں بلکہ بعض عصری کیفیت کی ترجمانی کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ پوری نظم ایک علامتی اظہاریے کے مترادف ہے جو اپنی پیوستگی اور انضباط(coherence and organisation) کے اعتبار سے انتہائی زرخیز ہے۔ اس نظم میں جو روحانی تجربہ سطح پر نظر آتا ہے وہ محض تجربے کی حیثیت سے زیادہ اہم نہیں بلکہ ان اقدار کی وجہ سے معنی خیز اور اہم بنتا ہے جو اس کی گہرائیوں میں مضمر ہے اور اس کے لیے قوت نمو فراہم کرتا ہے۔ جو موجودات کے تجسیمی مظاہر سے بلند ہو کر ان کی بطونی ماہیت کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور جو سائنسی تصور کائنات کو مصور کائنات کی ہمہ گیری سے مربوط کرتا ہے۔ جو ہمہ اوست یا 'از ہمہ اوست' کی فلسفیانہ موشگافیوں سے ورا الوریٰ ان مستتر حقائق کو واشگاف کرتا ہے جو ذہن انسانی کی محدود وسعتوں میں جلوہ گر ہو سکتے ہیں۔ زبان کے حدود و قیود کے باوجود اقبال کا رہوار تفکر اور توسن تخیل سبک گامی سے شعری کائنات کے ایسی منازل طے کرتا نظر آتا ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے سعی بلیغ ناگزیر ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* سابق ڈین، شعبۂ انگریزی، کماؤں یونی ورسٹی، اترا کھنڈ۔

۱۔ سورۃ الانبیاء کی آیات نمبر ۳۰ تا ۳۲ کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"کیا کافر لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین باہم ملے جلے تھے پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے پیدا کیا، کیا یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔ اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنا دیے تاکہ وہ مخلوق کو ہلا نہ سکے، اور ہم نے اس میں کشادہ راہیں بنا دیں تاکہ وہ راستہ حاصل کریں۔ آسمان کو محفوظ چھت بھی ہم نے ہی بنایا ہے لیکن لوگ اس کی قدرت کے نمونوں پر دھیان ہی نہیں دھرتے۔"

۲۔ محمد اقبال، ''تنہائی'' مشمولہ کلیات اقبال فارسی (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء)، ص۲۷۲۔

۳۔ محمد اقبال، ''جاوید کے نام'' مشمولہ کلیات اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص۱۷۷۔

۴۔ القرآن الکریم، سورۃ ہود، آیت نمبر۷۔

۵۔ القرآن الکریم، سورۃ الانبیاء، آیت نمبر۳۰۔

۶۔ محمد اقبال، ''تنہائی''، ص۲۷۲۔

۷۔ القرآن الکریم، سورۃ الانبیاء، آیت نمبر۳۱۔

۸۔ محمد اقبال، ''تنہائی''، ص۲۷۲،۲۷۳۔

۹۔ محمد اقبال، ''حقیقت حسن'' مشمولہ کلیات اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص۱۳۸۔

۱۰۔ محمد اقبال، ''چاند'' مشمولہ کلیات اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص۱۰۵،۱۰۶۔

۱۱۔ محمد اقبال، ''جگنو'' مشمولہ کلیات اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص۱۱۔

۱۲۔ محمد اقبال، ''چاند''، ص۱۰۶۔

۱۳۔ القرآن الکریم، سورۃ الانبیاء، آیت نمبر۳۳۔

۱۴۔ محمد اقبال، ''تنہائی''، ص۲۷۳۔

۱۵۔ محمد اقبال، بال جبریل مشمولہ کلیات اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص۳۶۴۔

۱۶۔ محمد اقبال، بال جبریل مشمولہ کلیات اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص۳۵۵۔

۱۷۔ محمد اقبال، ''فلک عطارد'' مشمولہ کلیات اقبال فارسی (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء)، ص۵۳۲۔

۱۸۔ القرآن الکریم، سورۃ الرحمٰن، آیت نمبر۲۷۔

۱۹۔ ڈبلیو ٹی سٹیس (W. T. Stace)، *The Teachings of the Mystics* (نیویارک: نیو امریکن لائبریری، ۱۹۶۰ء)، ص۲۱۴۔

۲۰۔ القرآن الکریم، سورۃ النساء، آیت نمبر۱۔

مآخذ

القرآن الکریم

اقبال، محمد۔ کلیات اقبال اردو۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۰ء۔

اقبال، محمد۔ کلیات اقبال فارسی۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء۔

سٹیس، ڈبلیو ٹی (W. T. Stace)۔ *The Teachings of the Mystics*۔ نیویارک: نیو امریکن لائبریری، ۱۹۶۰ء۔